بھی ایک متنازع مسئلہ بن گیا ہے اور ساری توجہ شریعت کی کلید سے زندگی کے مسائل حل کرنے سے ہٹ کر سیاسی اور قانونی موشگافیوں ہی پر نہیں، بلکہ نیتوں کے فتور اور انفرادی اور گروہی اقتدار کی شرمناک جنگ پر مرکوز ہو گئی ہے۔ ایک طبقہ جو خواہ اپنی تعداد اور عوامی بنیاد کے اعتبار سے کتنا ہی قلیل اور غیر ثقہ کیوں نہ ہو، مگر سیاسی اثرات، ذرائع ابلاغ میں اپنی قوت اور بیرونی تائید و معاونت کے اعتبار سے بڑا زور آور ہے، کھل کر اسلام، اسلامی ریاست، شریعت کی بالادستی اور اجتماعی زندگی میں دین کے کردار ہی پر حملہ آور ہو گیا ہے۔

ان حالات میں ضرورت ہے کہ اس شور و غوغا میں اصل مسئلے کو گم ہو جانے سے بچایا جائے، ہر جماعتی، گروہی اور ذاتی اختلاف، مفاد اور تعصب سے بالا ہو کر نفاذ شریعت کی حقیقت کو سمجھا جائے اور اسے حقیقت بنانے کے لیے جس طرز فکر، طریق کار اور عملی اقدام کی ضرورت ہے، اس کی نشاندہی کی جائے تاکہ شریعت، جو نام ہے دین اسلام اور اس کے دیے ہوئے طرز فکر و عمل کا، اور جس کی امتیازی خصوصیت ہی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ منزل مقصود تک لے جانے والا (حنیفیہ)، نرمی اور آسانی پیدا کرنے والا (سمحہ) سہولت بخش (سہلہ) منور، تابناک (بیضاء) اور اتنا واضح ہے کہ اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے (لیلھا کنھارھا)، عملاً نافذ ہو۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم ان چند بنیادی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرنا چاہتے ہیں جو اس بحث میں بڑے بڑے جغادری اور بااثر افراد کی طرف سے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہیں۔

سب سے افسوس ناک اور باغیانہ رویہ ملک کی سیکولر اور غیر مسلم لابی کا ہے۔ یہ لابی کھل کر اسلامی ریاست اور شریعت کی بالادستی کے خلاف محاذ آرائی میں پیش پیش ہے اور بڑے تند اور تلخ انداز میں جارحانہ طور پر حملہ آور ہے۔ اس میں پیپلز پارٹی کی سربراہ سے لے کر انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق کا نام لینے والے منظم گروہ تک سب ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ بے نظیر صاحبہ نے کھل کر اپنے مذموم لبرلزم کی علم برداری کا دعویٰ کرتے ہوئے نفاذ شریعت کی ہر کوشش کو مذہبی انتہا پرستی، اور جنرل ضیاء الحق مرحوم کی ذریت کی ریشہ دوانی قرار دیا ہے۔ پاکستان میں حقوق انسانی کے نام پر ہنگامہ برپا کرنے والا پورا طائفہ وائیں بائیں ہر طرف اپنی توپیں داغ رہا ہے۔ عیسائی قیادت تلوار بے نیام کر کے میدان میں کود پڑی ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کے اپنے ملک میں ان کی اپنی شریعت نافذ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے! اس کے ساتھ ہی ساتھ مغربی ذرائع ابلاغ اور پالیسی ساز جمہوریت اور اکثریت سے فیصلوں کے سارے دعووں کے باوصف اس معمولی سی اقلیت کی آواز میں آواز ملا رہے ہیں اور اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

ایک دوسرا طبقہ ذرا دوسرے انداز میں کرم فرما ہوا ہے۔ اسے کھل کر سیکولرازم، لبرلزم اور لادینیت کی

بات کرنے کی تو ہمت اور جرات نہیں۔ اس لیے اس نے ایک خیالی خطرے کا ہوا اٹھایا ہے، یعنی اس کا نشانہ نام نہاد مذہبی پیشوائیت، تھیوکریسی اور "ملا کا اسلام" ہے اور "اقبال اور قائداعظم کے اسلام" کا نام لے کر یہ نفاذ شریعت کی راہ کھوٹی کرنا چاہتا ہے۔

حکومت کے پیش کردہ دستوری ترمیمی بل میں جو نقائص اور خامیاں ہیں، وہ لازماً قابل اصلاح ہیں اور ان تبدیلیوں اور اصلاحات کے بغیر وہ قوم کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ قرآن و سنت کی بالادستی سے متعلق دستوری ترمیم لانے والوں کی نیتوں اور ان کے اپنے مقاصد اور سیاسی مصالح کی جو بھی صورت ہو، خاصے وقیع حقائق شبہات کو جنم دے رہے ہیں۔ لیکن ملک کے عوام اور اس کی اسلامی قیادت کو ان پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے اصل سوال --- یعنی شریعت کی بالادستی کے قیام کی تحریک کو، خواہ وہ کسی بھی سمت سے آئے اور کسی بھی شکل میں ہو، تقویت پہنچانے اور اس مسئلے کو دستوری اور قانونی اعتبار سے ایک بار مکمل طور پر طے کرا لینے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنا اور تحریک پاکستان کے حقیقی مقاصد کو پورا کرنا اور ان قربانیوں کا حق ادا کرنا ہے جو پاکستان کو دور حاضر میں اسلام کی حقیقی تجربہ گاہ بنانے کے لیے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے دی تھیں اور جس کے لیے تحریک اسلامی نے ۱۹۴۸ میں مطالبہ نظام اسلام کی آواز بلند کی اور اس دن سے لے کر آج تک شریعت کی بالادستی اور دین حق کی اقامت کے لیے جدوجہد کی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے بندے کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے مالک و آقا اور رب کو تسلیم کرے یا نہ کرے اور اپنے لیے اللہ کی بندگی یا اس سے بغاوت کا راستہ اختیار کرے (اور یہی معنی ہیں لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ کی ضمانت کے) تو بلاشبہ ہم یا کوئی مسلمان ملک انسانوں کو ان کے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔ لیکن دو باتیں صاف ہونی چاہییں:

جہاں کفر اور انکار کی راہ اختیار کرنے والوں کو اپنے ذاتی عقیدے اور عمل کی آزادی کا اختیار حاصل ہے، وہاں انھیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو، جو اپنے عقیدے اور ایمان کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن و سنت کی بالادستی کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے ہیں، اس عمل سے روکیں اور اس کے لیے بیرونی، سیاسی اور تہذیبی قوتوں کی معاونت سے زور آوری کا ہر حربہ استعمال کریں۔ سیکولر لابی جو دوسروں کو "مذہبی فسطائیت" کا طعنہ دیتی ہے، خود بدترین "سیکولر فسطائیت" کی مرتکب ہو رہی ہے۔ اس محدود اقلیت کو، اپنے سارے اثر و رسوخ اور وسائل ابلاغ پر قدرت کے باوجود، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے روکے۔ ان

حضرات کو اپنی بات پر قائم رہنے اور اس کے اظہار کی آزادی کا حق ہے اور ہم اس کا دفاع کریں گے۔ لیکن ان کا بھی فرض ہے کہ اپنی رائے اور ترجیحات کو ملت اسلامیہ پاکستان کی عظیم اکثریت پر مسلط کرنے سے احتراز کریں۔ جمہوریت کو اصل خطرہ اس آمرانہ اور جارحانہ ذہنیت سے ہے اور اسے قابو میں رکھنا خود جمہوریت کے فروغ اور استحکام کے لیے ضروری ہے۔

خود مسلم معاشرے میں جو کمزوریاں اور نظریاتی تنوع بہت سے تاریخی اسباب کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے اس کو برداشت کرنا ضروری ہے۔ افہام و تفہیم، تعلیم و تعلم اور بحث و مباحثہ اور مکالمے کے ذریعے مختلف علیہ اور مختلف فیہ کا تعین ہو سکتا ہے۔ اتفاق کے وسیع دائرے میں تعاون ہو اور اختلاف کا احترام بھی اصول کے معاملات میں یکسوئی اور استقامت کی طرح ضروری سمجھا جائے۔ مسلم معاشرہ آزادی اور رواداری کی بنیاد پر وجود میں آتا اور ترقی کرتا ہے۔ کثرت میں وحدت اور حدود اللہ کے دائرے میں تنوع اس کی امتیازی شان ہے۔ اس کی مثال اس باغ کی سی ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوں ع

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

سارے اختلافات کے باوجود نرمی اور توسع ہمارا شعار رہا ہے اور آج بھی اسی میں بقا اور ترقی کا راز مضمر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جن چیزوں پر عظیم اکثریت یکسو ہے، جن کو وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتی ہے اور جن پر اپنی اخروی زندگی کی کامیابی کا یقین رکھتی ہے، ان کے بارے میں محض کسی اختلافی نقطہ نظر کے دباؤ میں عمل نہ کیا جائے۔ جس طرح نظریاتی اقلیت کے حقوق ہیں، اسی طرح نظریاتی اکثریت کے بھی حقوق ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔

یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان ہونے اور قرآن و سنت پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے یا نہیں، یہاں تک تو اس کو آزادی حاصل ہے، لیکن اسلام کو قبول کرنا ایک ذمے داری ہے۔ ہر ذمے داری کی کچھ بنیادی تقاضے ہوتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انسان کی یہ آزادی کچھ میدانوں میں محدود ہو جاتی ہے اس لیے کہ اسلام نام ہی اس عہد کا ہے کہ انسان اللہ کو اپنا رب، خاتم الانبیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول، ہادی، آقا اور رہبر، اور اسلام کو اپنا دین اور طریق زندگی تسلیم کر لے اور اس پر راضی اور مطمئن ہو جائے۔ "جزوی مسلمان" یا "نیم مسلمان" کا کوئی تصور دائرہ اسلام میں نہیں اور عقل بھی اسے گوارا نہیں کرتی۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (البقرہ ۲:۲۰۸) "اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو، دائرہ اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے، اور شیطان کے طریقے پر عمل پیرا نہ ہو"۔

اسلام کی کچھ تعلیمات اور احکام کو ماننا اور کچھ کا انکار کر دینا، اللہ کی اطاعت اور بندگی کا راستہ نہیں

ہے۔ اسلام کے شعوری اقرار کے بعد بندہ اپنی آزادی کو اللہ کی حدود کا پابند کرلیتا ہے اور پھر صرف ان حدود کے دائرے میں اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ یہ تحدید وہ اپنی مرضی سے قبول کرتا ہے لیکن اس تحدید کے بعد یہ حق اسے نہیں رہتا کہ جس چیز کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے رد کر دے۔ یہ آزادی نہیں تناقض، دو رنگی اور منافقت ہے جس کی اسلام ہی نہیں کسی بھی نظام میں گنجایش نہیں ہو سکتی اور جس کے نتیجے میں بجز کش مکش اور صلاحیتوں اور وسائل کے ضیاع کے کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا فیصلہ ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف ۱۲: ۴۰) "فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے"۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف ۷:۳) "لوگو، جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو"۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ ۵: ۴۴) "اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں"۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ (النساء ۴: ۶۵) "نہیں (اے محمدؐ) تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سربسر تسلیم کرلیں"۔

یہ ہے سچے مسلمانوں کی روش۔ اسی کا تقاضا ہے کہ شریعت کو بالادستی حاصل ہو۔ ماننے والوں کے لیے صحیح راستہ یہی ہے اور نہ ماننے والوں کو حق نہیں کہ ماننے والوں کو اپنے ایمان اور عقیدے کے مطابق اپنی زندگی کی شاہراہ تعمیر کرنے سے روکیں۔

یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ اسلام ایک اور صرف ایک ہے اور وہ اللہ کا بھیجا ہوا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دکھایا ہوا راستہ ہے۔ یہ مکمل نظام حیات ہے اور اس میں زندگی کے تمام مسائل اور معاملات کا حل بھی موجود ہے اور انسانی معاشرے میں تغیر و تبدل اور اسے ترقی و ارتقا کی جو حقیقی ضروریات ہیں ان کا بھی پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس فریم ورک میں اطاعت، آزادی، اختلاف اور تنوع ہر ایک کا اپنا مقام ہے لیکن یہ سب کچھ اس کے اپنے اصول اور ضابطوں کے مطابق ہے۔ جہاں اسلام زندگی کے بنیادی معاملات کے بارے میں واضح اور دو ٹوک رہنمائی دیتا ہے وہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے لیے بھی خود اپنے نظام میں کافی و شافی گنجایش اور مواقع رکھتا ہے۔ البتہ وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا جو اس کے

نظام اقدار کی ضد اور نفی کرنے والی یا ان کو مجروح کرنے والی ہو۔ خُذْمَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَر (جو صحیح اور صحت مند ہے اسے قبول کر لو اور جو ناموافق ہے اسے ترک کر دو) کا اصول اس عمل کو ہمیشہ جاری و ساری رکھتا ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے اعلان کے بعد زمان و مکاں کے تمام تغیرات اور وسعتوں کے باوجود آج تک اسلام ایک ہی رہا ہے۔ نہ عربوں کا اسلام کوئی الگ ہے اور نہ پاکستان، ایران، ترکی، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے مسلمانوں کا۔ اسی طرح پہلی صدی کا اسلام چوتھی صدی کا اسلام اور بیسویں صدی کا اسلام اپنا کوئی الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔ اسلام تو ایک ہی رواں دواں دریا کی مانند ہے جس میں پانی کے نئے دھارے ملتے بھی رہتے ہیں اور اس کی نوعیت اور سمت پھر بھی ایک جیسی ہی رہتی ہے خواہ ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل، مالک، غزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ کا تصور اسلام ہو یا اقبال اور قائداعظم کا تصور۔ یہ سب اسی ایک اسلام کے علم بردار تھے اور قرآن و سنت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے باہر یا اس میں غیر اسلام کی آمیزش کے رونما ہونے والے کسی نظرثانی شدہ اسلام کے نہ قائل تھے اور نہ داعی۔ ان پر اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ ان کے اسلام اور ملا کے نام نہاد اسلام کو دست و گریباں کیا جائے اور اقبال اور قائداعظم کا نام لے کر اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت سے فرار کی راہیں تلاش کی جائیں۔ علامہ اقبال کی تو پوری زندگی کا مشن اور پیغام ہی یہ تھا کہ:

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصلِ سُنت جز محبت ہیچ نیست
ملت از آئینِ حق گیرد نظام
از نظامِ محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علم او پیدا ستے
ہم عصا و ہم یدِ بیضا ستے
با تو گویم سِرِّ اسلام است شرع
شرع آغاز است و انجام است شرع
ہست دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

رہے قائداعظمؒ اور ان کے حقیقی رفقا (نواب زادہ لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل خاں، بہادر یار جنگ،

سردار عبدالرب نشتر، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ) تو تحریک پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے بعد کم از کم دو سو ایسے واضح بیانات تو صرف قائداعظمؒ کے موجود ہیں جن میں اسلام کو اس جدوجہد کی منزل اور قرآن، اسوہ رسولؐ، اسلامی قوانین اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بالادستی کے قیام کو پاکستان کا مشن اور ہدف قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کی دو ایک تقاریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ان کے تصورات کی غلط تصویر پیش کرنے کی مذموم سعی کی جاتی ہے۔ یہ روش ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے اور تمام حقائق کے سامنے آ جانے کے باوجود ایک گروہ وہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ اس سے خود اس گروہ کی بدنیتی بے نقاب ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کا مقصد قائد اعظم کے پورے تصور کو پیش کرنا نہیں، بلکہ اپنے مقاصد کے لیے چند جملوں کو استعمال کرنا ہے۔ ایسی صریح بددیانتی پر اٹھائی جانے والی دیوار ریت کی دیوار ہی ہو سکتی ہے جو کسی تعمیر میں کام نہیں آ سکتی۔

کراچی میں ۱۹۴۳ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا:

> وہ کون سی چٹان ہے جس پر ملت کی عمارت قائم ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جو سفینہ ملی کو تھامے ہوئے ہے؟ مسلم انڈیا کے سفینہ ملی کا مستحکم لنگر عظیم المرتبت کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے ویسے ویسے ہماری یہ وحدت بھی بڑھتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، ایک قبلہ اور ایک قوم!

سرحد مسلم طلبہ کی فیڈریشن کو جو پیغام قائد نے ۱۹۴۵ میں دیا، وہ یہ تھا:

> پاکستان کا مطلب صرف آزادی و حریت کا حصول نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریے کا تحفظ بھی ہے جس کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ قیمتی تحفے اور بیش بہا خزانے ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔

اسی سال عید کے پیغام میں فرمایا:

> بجز ان لوگوں کے جو بے خبر ہیں ہر شخص آگاہ ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر و بالاتر اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ مذہبی بھی، معاشی و معاشرتی بھی، دیوانی بھی، فوجداری بھی، تجارتی بھی، عدالتی بھی اور تعزیری بھی ـــــ یہ ضابطہ زندگی کی ایک ایک چیز کو باقاعدگی اور ترتیب عطا کرتا ہے۔

سبّی دربار کے موقع پر ۱۲ فروری ۱۹۴۸ کو قائد نے عہد کیا:

> میرا ایمان ہے کہ ہم سب کی نجات ان سنہری قواعد اور زریں احکام کی پیروی میں مضمر ہے جو ہمارے رہن سہن اور معاملات زندگی کو درست رکھنے کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیے ہیں۔ آیئے ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر استوار کریں۔ خدائے قادر و مطلق نے ہمیں سکھایا ہے کہ مملکت کے تمام امور میں ہمارے فیصلے بحث و تمحیص

اور مشاورت کی رہنمائی میں ہوں۔

ہمیں بتایا جائے کہ قرآن و سنت کی واضح شاہراہ اور اسلام کے ضابطہ قانون سے ہٹ کر اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا اسلام کون سا ہے؟ یہ ان دونوں بزرگوں پر تہمت اور خلط مبحث کی ایک شرمناک کوشش ہے۔ شریعت میں کوئی ابہام نہیں اور ہر مسلمان اس شریعت کا علم بردار اور طالب ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنی امانت کی شکل میں دی ہے۔ شریعت جو ہماری آزادی، دنیوی فلاح اور اخروی کامیابی کی ضامن ہے، جو تمام انبیا کی سنت رہی ہے اور جسے اپنی آخری اور مکمل شکل میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت تک پہنچایا اور آج جس کی امین امت مسلمہ ہے۔ کامیاب اب وہی ہو گا جو اس راستے پر گامزن ہو۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (الاعراف ۷: ۱۵۷)

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی اُمّی، (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

شریعت اور اس کے نفاذ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کی نوعیت اور حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور جو فرق شریعت یا اسلامی قانون اور مغربی قانون میں ہے، اسے نظر میں رکھا جائے۔ لغت کے اعتبار سے "شرع" اور "شریعت" کے معنی راستے کے ہیں۔ پرانے زمانے میں گھریلو استعمال کے لیے پانی، محلے یا دیہات کے کنویں، تالاب، نہر یا چشمے وغیرہ سے لایا جاتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کے بار بار وہاں آنے جانے سے ایک ایسا راستہ بن جاتا تھا جو سیدھا، مختصر، کشادہ، واضح اور صاف ہوتا تھا۔ اسی راستے کو عربی لغت میں شریعت کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ سیدھا، کشادہ اور واضح راستہ جو کسی بستی کے لوگوں کو پانی کے ذخیرے اور مصدر و ماخذ تک پہنچا دے۔ خود قرآن میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے اور

اصطلاحی اعتبار سے شریعت سے مراد زندگی گزارنے کا وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کے لیے مقرر فرمایا اور جو دین کے احکام اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے اور انسانی زندگی کی ان اصولوں کے مطابق عملی تشکیل کرنے کا واحد راستہ ہے۔

قرآن و سنت اس شریعت کے اصل اور بنیادی مآخذ ہیں۔ اس کے ایک حصے کا تعلق عقائد، افکار اور احساسات سے ہے اور دوسرے کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے۔ فقہ یا اسلامی قانون، شریعت کے اس حصے کا نام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اسلامی تشکیل سے بحث کرتا ہے۔ فقہاے کرام فقہ کی یہی تعریف کرتے ہیں: العلم بالاحکام الشریعہ العملیہ عن ادلتھا التفصیلیۃ یعنی فقہ وہ علم ہے جس کے ذریعے شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے۔ شریعت انسان کی عملی زندگی کے کم و بیش ہر پہلو کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اس کے احکام جہاں ایک طرف امر و نہی، حلال و حرام، مستحب اور مکروہ کی نشاندہی کرتے ہیں، وہیں حدود کی اس صف بندی کے ساتھ ساتھ مباح اور انسانی آزادی کے میدان کو بھی واضح اور نمایاں کر دیتے ہیں۔ اور یہی وہ میدان ہے جس میں ہر دور میں اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعے نئی قانون سازی کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی رہے گی۔

شریعت کے ایک حصے کا نفاذ ہر فرد اور ادارہ خود اپنی ذاتی مرضی اور داعیہ (initiative) پر کرتا ہے۔ اس طرح ایک خود کار نظام (self-executing system) کے ذریعے شریعت مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رچی بسی ہوئی ہے۔ عبادات و مناکحات میں معاملات کا ایک بڑا حصہ آ جاتا ہے۔ لیکن شریعت کا ایک حصہ وہ ہے جسے نافذ کرنے کے لیے معاشرے اور ریاست کی اجتماعی قوت درکار ہوتی ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس کے لیے آج کے دور میں دستور، قانون، ریاستی مشینری اور ضابطہ کار اور عدالتی نظام کو شریعت کے مقاصد اور احکام کا خادم اور کارندہ بنانا ضروری ہے۔

اسلامی قانون بیک وقت ایک خالص مذہبی، نظریاتی اور روحانی قانون ہی نہیں بلکہ ملکی اور عدالتی قانون بھی ہے۔ دوسری تہذیبوں اور مذاہب میں مذہبی قانون اور ملکی اور عدالتی قانون میں فرق کیا گیا ہے۔ مذہبی قانون بالعموم فرد کا ذاتی معاملہ سمجھا گیا اور اس کے نفاذ کو بھی اس کے فہم و ارادہ اور ضمیر پر چھوڑ دیا گیا۔ ریاستی اور عدالتی قانون صرف دنیاوی معاملات سے متعلق رہا اور اس کا انحصار رسم و رواج، بادشاہ کے حکم یا کسی بالاتر مقتدر یا مقننہ کے فیصلہ اور عدالت کے فیصلے کی نظیر پر رہا۔ اسلامی قانون میں وحدت، ہم آہنگی اور ہمہ گیری ہے۔ یہ قانون محض عبادات اور اللہ اور بندے کے تعلق تک محدود نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کا تعلق انسانوں سے اور فرد کا معاشرے، اجتماع اور ریاست سے تعلق بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ اسلام کا قانون شخصی، معاشی، دیوانی، تعزیری، بین الاقوامی تمام دائروں پر محیط ہے۔ یہ عبادات سے لے

کر، خاندانی زندگی، معاشی تگ و دو، عمرانی معاملات، جرم و سزا، جنگ و صلح، غرض ان سب کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔

ایک مذہبی قانون ہونے کی حیثیت سے یہ ہر مسلمان کے ایمان کا معاملہ ہے اور اس پر عمل اس کے ایمان اور عقیدے کا تقاضا ہے۔ اس لیے قانون محض جبر اور قوتِ قاہرہ (coercive power) کی علامت نہیں بلکہ ایمان کا تقاضا، دل کی پکار، زندگی کی آرزو اور اجتماعی زندگی کا ادب بن جاتا ہے۔ اس کا نفاذ صرف ڈنڈے اور پولیس کے ذریعے نہیں بلکہ ضمیر کی آمادگی اور رب کی طاعت گزاری کے جذبے سے عبارت ہے۔ بلاشبہ پولیس اور عدالت کا بھی ایک مقام ہے لیکن جو چیز اسلام کے قانون کو منفرد درجہ دیتی ہے وہ اندر کی آواز اور باہر کے قانون کی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کو تقویت دینے کی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون پر پولیس کے پہرے اور مخبروں کے خوف سے کہیں زیادہ ضمیر کی خلش اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے عمل ہوا ہے۔ رات کی تاریکیوں اور تنہائیوں میں بھی اس پر عمل درآمد کا جذبہ ویسا ہی قوی ہوتا ہے جیسا دن کی روشنی اور محتسب کی موجودگی میں۔ اور جرم کے ارتکاب کے بعد توبہ ہی نہیں بلکہ پاکی کے حصول کے لیے "مجرم" خود سزا کا طالب بن جاتا ہے۔

جہاں اسلامی قانون کی یہ روح ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت اپنے نفاذ کو محض ضمیر اور فرد کے ذاتی جذبے پر نہیں چھوڑتی، بلکہ انسانی فطرت اور معاشرے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ریاست کی شیرازہ بندی کے واضح احکام دیتی ہے، نظام امر قائم کرتی ہے، انتظامی مشنری وجود میں لاتی ہے، پولیس اور عدالت کے نظام کو قائم کرتی ہے اور اس طرح اندرونی قوت اور جذبے کی تکمیل بیرونی قوت اور نظام کے ذریعے کرتی ہے۔ ریاست اپنے تمام اداروں کے ذریعے ایک طرف تلقین، تعلیم اور بہتر نمونہ کا اہتمام کرتی ہے تو دوسری طرف ریاستی قوت اور عدالتی اداروں کے ذریعے قانون توڑنے والوں کی گرفت اور معاشرے کو جرم اور ظلم سے پاک کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ دین اور ریاست ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن جاتے ہیں۔ سیکولر ریاست اور اس کے تمام ادارے دین کی رہنمائی سے آزاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دین ریاست اور معاشرے کے وسائل سے محروم رہتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ اسلام ایک بنیاد ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور حکومت ایک نگہبان اور محافظ ہے۔ اگر کسی عمارت کی بنیاد نہ ہو تو وہ کمزور رہتی ہے اور گر جاتی ہے اور اگر کسی عمارت کا کوئی محافظ اور نگہبان نہ ہو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے، اس کو لوٹ لیا جاتا ہے یا اس پر دوسرے قابض ہو جاتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ:

- شریعت پوری زندگی کے لیے راہ عمل ہے۔
- قرآن و سنت اور ان کی روشنی میں مستنبط کیے ہوئے احکام ہی مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔
- یہ شریعت زندگی کے تمام امور پر حاوی ہے۔
- دنیوی قوانین کی طرح یہ محض ریاست کی قوت قاہرہ کے آگے سرتسلیم خم کرنا نہیں ہے بلکہ یہ قانون' ایمان و ضمیر کی پکار کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
- اندرونی داعیہ کے ساتھ ساتھ ریاستی' انتظامی اور عدالتی نظام کا خود شریعت کے ماتحت ہونا اور اس کے نفاذ کے عمل میں شرکت اور معاونت کے لیے مثبت اور موثر کردار ادا کرنا' اس نظام کا حصہ ہے۔
- شریعت کے نفاذ کا عمل ایمان اور ضمیر کی بیداری' تعلیم و تلقین کے نظام' معاشرے کے آداب و روایات اور قانون کی قوت' ان سب کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ نہ محض اخلاقی تلقین اور نہ محض جبر و قوت کا استعمال۔

مندرجہ بالا عوامل کا ساتھ ساتھ موثر ہونا شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔

یہ عمل ہر فرد سے دل کی گہرائیوں سے اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے سرشار ہو کر شرکت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت' ریاست اور اس کے تمام اداروں کے لیے بھی لازم کرتا ہے کہ وہ تعلیم و تلقین اور اچھی مثال کے ساتھ ساتھ نیکی کا حکم اور برائیوں کے روکنے کا کام انجام دیں۔ حق دار کو اس کا حق پہنچانا اور ظالم کو ظلم سے روکنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز اور روزے کا اہتمام--- بلکہ نماز تو ہے ہی اس لیے کہ برائیوں سے روکے (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ)۔ اور روزے کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ متقی بنیں اور قانون کی پاس داری کریں (لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ)۔

شریعت کے نفاذ کا کام بڑا منفرد اور بابرکت ہے۔ اس میں قانون اور اس کی حقیقی اسپرٹ دونوں کا ساتھ ساتھ اہتمام ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمل میں فرد' عوام' نظام تعلیم' ذرائع ابلاغ' اجتماعی اداروں اور حکومت سب کی شرکت ضروری ہے۔ البتہ دو وجوہ سے حکومت کا کردار سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے اور وہ یہ ہیں:

اولاً' آج کی ریاست ایک ہمہ گیر ادارہ بن گئی ہے جو ملک اور معاشرے کے وسائل کے بڑے حصے پر تصرف کے اختیارات رکھتی ہے۔ اس لیے جب تک یہ وسائل شریعت کے تابع اور اس کے نفاذ کے لیے استعمال نہ ہوں تبدیلی نہیں آسکتی۔

ثانیاً، مسلم معاشرہ صدیوں سے انتشار، اضمحلال اور غلامی کے بعد نئی زندگی کی تعمیر کے لیے سرگرداں ہے۔ صدیوں میں جو ادارے قائم ہوئے تھے اور جو اسلامی نظام کے لیے لنگر کا کام کر رہے تھے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ تعلیم کا ایک لادینی نظام دو صدیوں سے قوم پر مسلط ہے اور اس کے نتیجے میں وہ کیفیت واقع ہو گئی ہے جسے اقبال نے یوں ادا کیا تھا۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غیر اسلامی اور مغربی دنیا سے در آمد شدہ ادارے اور انتظامی در و بست مسلم معاشرے پر بزور ٹھونسے جا چکے ہیں۔ ان حالات میں تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فرد کی کوششوں کے ساتھ معاشرہ، ریاست اور اس کے تمام ادارے ظلم اور باطل سے نجات اور حق اور معروف کے قیام میں مکمل طور پر شریک نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف انفرادی کوششیں بار آور نہیں ہو رہیں۔ نجی طور پر خیر کے فروغ اور بدی کے مٹانے کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ بہت غنیمت ہے اور اس کے اچھے اثرات بچشم سر دیکھے جا سکتے ہیں، مگر مطلوبہ تبدیلی کے لیے وہ کافی نہیں۔ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں اس کش مکش اور اس کے برے نتائج کو دیکھا جا سکتا ہے۔ زندگی کو اس تناقض (contradiction) اور تصادم سے پاک کیے بغیر ہم اپنے انسانی اور مادی وسائل کو صحیح استعمال نہیں کر سکتے اور مطلوبہ نتائج رونما نہیں ہو سکتے۔

آج مسئلہ صرف انفرادی خطا اور بے راہ روی نہیں اجتماعی فساد اور منظم ظلم ہے۔ اس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ گویا زمین و آسمان بگاڑ اور فساد سے بھرے گئے ہیں (ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ)۔ ان حالات میں اجتماعی قوتوں کو تعلیم و تلقین، مظلوم کی داد رسی، حق دار کو حق پہنچانے اور ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے استعمال کیے بغیر شریعت کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ شریعت روحانی اور اخلاقی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انصاف کا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتی ہے۔ جب تک معاشرے سے ظلم اور فساد دور نہیں ہو جاتے، غربت اور افلاس کا خاتمہ نہیں ہوتا، مجبور اور مظلوم قوی نہیں بن جاتے اور منہ زور اور ظالم قابو میں نہیں کر دیے جاتے---- شریعت کے اہداف حاصل نہ ہو سکیں گے۔ اور یہی وہ میدان ہے جس کی اصلاح کے لیے ریاست اور اس کی اجتماعی قوتوں کو اسلام کے لیے مسخر کرنا ضروری ہے تاکہ قرآن کے الفاظ میں انسانوں کے لیے انصاف اور عدل قائم ہو سکے (لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ)۔

سوال یہ ہے کہ اس منزل کی طرف پیش قدمی کیوں نہیں ہو پاتی؟ اصل کمی، کسر اور بگاڑ کہاں ہے؟ شریعت کے نفاذ کی راہ میں اصل رکاوٹیں کیا ہیں اور ان کا سدباب کیسے ممکن ہے؟

جیسا کہ ہم نے اوپر نشاندہی کی شریعت نے اپنے نفاذ کے لیے چار راستے اختیار کیے ہیں۔ یعنی (۱) ایمان اور اندرونی محرک (۲) تعلیم و تلقین اور وعظ و نصیحت کا ایک ہمہ گیر نظام دعوت (۳) معاشرہ اور اس کے ادارے، خاندان سے لے کر وقف اور تکافل اجتماعی (رفاہ عامہ) تک اور (۴) ریاست، قانون اور نظام قضا (عدالتی نظام)۔

شریعت چاہتی ہے، یہ تمام کام انفرادی اور نجی سطح پر بھی انجام دیے جائیں اور اجتماعی طور پر بھی۔ چونکہ ریاست نظام امر کا مرکز ہے اور اللہ کے رسولؐ نے جو وظائف بحیثیت سربراہ انجام دیے ان کی امین ہے۔ اس لیے ریاست اور حکومت کی ذمہ داری دوہری ہے، یعنی خود اپنے دائرے میں اپنے فرائض کی انجام دہی اور دوسرے تمام اداروں کی معاونت و سرپرستی، تاکہ فرد اور سول ادارے اپنے اپنے کردار بخوبی انجام دے سکیں۔

اجتماعی دائرے میں نفاذ شریعت کے لیے جو حکمت عملی مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں اختیار کی ہے اس میں تنوع اور جدت ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت کے حالات اور مسائل کی روشنی میں انھوں نے کیا کیا راستے اختیار کیے۔ اصل نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہے جو داعی اور مربی اور معلم بھی تھے اور سربراہ مملکت، قاضی اور حاکم بھی۔ آپؐ کی رہنمائی میں ایک مرکزی نظام کے ذریعے مندرجہ بالا چاروں دائروں کی رہنمائی کا حق ادا کیا گیا اور تاریخ کا روشن اور کامیاب ترین انقلاب رونما ہوا۔ خلافت راشدہ نے اسی نمونے پر عمل کیا اور نظام ریاست و قیادت میں شگاف پڑنے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اموی دور میں اس نمونے کے احیا کی کامیاب کوشش کی۔ بعد کے ادوار میں یہ مرکزیت اور ہمہ گیری باقی نہ رہی لیکن ہر ہر میدان کے لیے موثر انتظام کی کوشش کی گئی اور وقت کے چیلنجوں کی روشنی میں خصوصیت سے ریاست، قانون اور نظام عدالت کو اسلام کے مطابق اور شریعت کی حدود میں رکھنے کے لیے نئے تجربات اور نئے انتظامات کیے گئے۔ اس سلسلے کا سب سے عظیم اور تاریخی کارنامہ امت کے معتبر اور معتمد علما کا غیر سرکاری انتظام کے تحت فقہ اور اصول فقہ کی تدوین ہے۔ یہ قانون اخلاقی اور اجتماعی عوامی قوت و تائید سے ملک کا قانون بنا اور ایک موثر اور آزاد نظام قضا (عدل) کا قیام عمل میں آیا جو شریعت کے نفاذ کا ضامن بن گیا اور خود ارباب اقتدار بھی اس قانون کے اسی طرح تابع ہو گئے جس طرح باقی انسان۔

اس طرح قانون کا وہ تصور جو دوسری تہذیبوں اور مملکتوں میں "حکمران کی مرضی" کے مترادف تھا بالکل بدل گیا۔ اسلامی قلمرو میں "شریعت" ہی ملک کا قانون بن گئی اور حکمران کی مرضی بھی اس کے تابع ہو گئی۔ یہ قانون کسی قانون ساز اسمبلی نے نہیں بنایا تھا، مگر اس کی تشکیل و ترقی میں سرکاری سرپرستی یا نظام سے وابستہ کسی ادارے نے نہیں بلکہ مسلمان امت اور اس کے آزاد فکری قائدین، علما، فقہا اور دوسرے

امور زندگی کے ماہرین نے حصہ لیا۔ ایک عوامی اور جمہوری طریقے اور عمل سے یہ قانون وجود میں آیا اور مسلسل ترقی کرتا رہا۔ اجتہاد، قیاس، استنباط، استحسان، مصالح مرسلہ، استدراک اور اجماع کے ذریعے یہ ایک تازہ پانی کی نہر کی طرح ترقی کرتا رہا اور ایک ہزار سال تک پوری اسلامی قلمرو کو سیراب کرتا رہا۔

ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کچھ خدا ترس حکمرانوں نے اس قانون کو مرتب اور مدون کر کے اپنی قلمرو میں نافذ کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں برعظیم پاک و ہند میں فتاوی عالم گیری نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح دولت عثمانیہ میں مجلہ احکام عدلیہ کی تدوین ریاست اور علما و فقہا کی مشترک کوششوں کی مثال ہے۔ لیکن بنیادی چیز اسلامی قانون کا یہ مزاج ہے کہ وہ محض حکمران کی مرضی یا ترجیحات یا مقننہ (قانون ساز ادارے) کی آزاد مرضی کا نام نہیں، بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام، منشا و مرضی اور قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کے بارے میں اصل ماخذ اور ان سے استفادے کے ضوابط کار کے مطابق رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔

یہی وہ چیز ہے جسے دور غلامی سے نجات پانے اور آزاد مسلمان ریاست کے قیام کے بعد دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں ملت اسلامیہ پاکستان مصروف ہے۔ برطانوی اقتدار کے نقصانات اور مظالم کی فہرست تو بہت لمبی ہے لیکن بیرونی استعمار کا سب سے پہلا ہدف شریعت اور نظام قضا ہی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے ہی ادارے تباہ کر دیے گئے اور آخری حصار یعنی خاندانی نظام پر بھی مختلف سمتوں سے تابڑ توڑ حملے کیے گئے اور اس عظیم الشان نظام کو تہ و بالا کر دیا گیا جو مسلمانوں نے اجتماعی میدان میں قائم کیا تھا۔

حصول آزادی کے بعد پہلا مرحلہ یہ تھا کہ ریاست کا قبلہ درست کیا جائے، اس کے مقاصد اور اہداف کو متعین کیا جائے اور نظام قانون کے اصول و ضوابط مرتب کیے جائیں۔ برطانوی دور میں تقریباً چار ہزار قوانین حکومت نے اپنے فرمان کے ذریعے مسلط کیے۔ ضرورت تھی کہ دستور کی صحیح بنیادوں پر تدوین کے بعد قانون کا جائزہ لیا جائے۔ ایمان اور آزادی کے تقاضوں کے مطابق پورے قانونی ورثے کا جائزہ لے کر نہ ان تقاضوں سے متصادم قوانین یا قوانین کے حصوں کو ختم کیا جائے بلکہ نئی قانون سازی ہو تاکہ مثبت انداز میں ان دونوں ضرورتوں کے مطابق نیا قانونی نظام اور عدالتی ڈھانچہ وجود میں آئے اور اس طرح وجود میں آئے کہ کوئی بحرانی کیفیت نہ پیدا ہو۔

قرارداد مقاصد اس سمت میں پہلا روشن اور تابناک قدم تھا۔ لیکن اس کے بعد سے آج تک ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی گردان کی جاتی رہی ہے۔ اور اس سے وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں بار بار نفاذ شریعت کے مطالبے اٹھتے ہیں اور حکمران جان بچانے کے لیے چند نمایشی اقدام تو کرتے ہیں لیکن کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوتی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا بہت قریب سے تجربہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں

ہوا۔ ہم نے پورے خلوص سے ان کو اسلامی نظام کے نفاذ کا ایک مربوط اور مکمل پروگرام دیا اور اپنی تمام سادگی اور اسلام کے لیے مخلصانہ جذبات کے اظہار کے باوجود وہ اس طرف کوئی حقیقی اور دیرپا پیش رفت نہ کر سکے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نفاذ شریعت کے مسئلے کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ پھر مسئلے کی نوعیت کی مناسبت سے عملی اقدامات کا ایک ہمہ جہتی پروگرام مرتب کیا جائے اور اس کے نفاذ کے لیے موثر اور کارفرما مشینری وضع کی جائے۔

نفاذ شریعت کسی ایک اعلان کا نام نہیں۔ یہ تو ایک مسلسل عمل (process) ہے جس کی مختلف جہتیں ہیں اور ہر جہت کو دوسری کا معاون و مددگار اور اس کی تقویت کا باعث ہونا چاہیے۔ تب ہی مربوط اور دیرپا نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ ضیاء صاحب بار بار کہتے تھے کہ آپ مجھے کوئی ایک چیز بتا دیں جس کے اعلان سے شریعت نافذ ہو جائے اور میں ہمیشہ ان کو یہی سمجھاتا تھا کہ اگر آپ فی الحقیقت نفاذ شریعت چاہتے ہیں تو اس کے لیے ایک اعلان نہیں، تبدیلی کا ایک مفصل اور مربوط پروگرام بنانا ہو گا--- اس کے اہم اجزا یہ ہیں:

۱۔ دستور میں قرآن و سنت (شریعت) کی بالادستی کا اظہار اور اسے قانون سازی اور پالیسی سازی کے لیے مستقل ماخذ قرار دینا۔ نیز دستور میں ایسی ترامیم جو اس کو شریعت سے متصادم اجزا سے پاک کر دے۔ دستور کو بار بار کھولنا یا مستقلاً عدلیہ کے رحم و کرم پر چھوڑنا صحیح نہیں۔ اسی لیے دستور سازی اور قانون سازی میں فرق کیا جاتا ہے اور اس کا احترام ہونا چاہیے۔ خاص طور پر جب ہم نے تحریری دستور کا راستہ اختیار کیا ہے تو اس کے تقاضے بھی پورے کرنے چاہییں۔

۲۔ دستور میں شریعت کے قانونی احکام کے نفاذ کے لیے ایک واضح اور موثر نظام کار کا تعین۔

--- دفعہ ۲۲۷ ایک اہم انتظام ہے لیکن اس کا تقاضا ہے کہ پارلیمنٹ ایک متعین مدت میں اپنا فرض انجام دے۔ ۱۹۷۳ کے دستور میں اس کے لیے ۷ سال کی مدت رکھی گئی تھی کہ اس زمانے میں تمام مروجہ قوانین کو شریعت سے ہم آہنگ کر لیا جائے گا۔ یہ کام آج تک نہیں ہوا ہے۔

--- اسی دفعہ کی رو سے آیندہ کے لیے بھی شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے قانون سازی ضروری ہے اور یہ قانون سازی، اسمبلی اور سینٹ کو اسلامی نظریاتی کونسل کے مشورے اور معاونت سے کرنا تھی۔ اس باب میں بھی ہمارا ریکارڈ بڑا ہی افسوس ناک ہے۔ برطانوی دور کے چار ہزار سے زیادہ قوانین کے مقابلے میں گذشتہ پچاس سال میں بمشکل چار سو قوانین منظور ہوئے ہیں جن کی بہت بڑی اکثریت صرف پرانے قوانین میں جزوی ترامیم پر مشتمل ہے۔ تعداد کے اعتبار سے بھی ان پچاس برسوں میں کی جانے والی قانون سازی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ معیار کی بات تو رہنے دیجیے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے ۱۹۶۲ سے اب تک تقریباً پچاس رپورٹیں تیار کی ہیں لیکن ان کی بنیاد پر کوئی قانون سازی نہیں ہوئی۔

۳۔ دستور نے شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں دفعہ ۲۲۷ کے ساتھ ایک دوسرا راستہ "پالیسی کے راہنما اصول" (باب ۲، دفعہ ۲۹ تا ۴۰) کی شکل میں نکالا۔ جو عدالتوں کے ذریعے تو نافذ العمل نہیں تھا مگر ہر سال پارلیمنٹ کو کارکردگی کی رپورٹ کی شکل میں اس عمل کو آگے بڑھانا پیش نظر تھا۔ اس سلسلے میں بھی پیش رفت صفر ہی رہی۔

ان تینوں کے عملاً غیر موثر ہو جانے کے بعد نفاذ شریعت کا ایک دوسرا نسبتاً مختصر راستہ عدلیہ کو یہ اختیار دینا تھا کہ خود اپنے ایما یا اختیار (suo muto) یا کسی کے توجہ دلانے اور استغاثہ کرنے پر کسی قانون کا جائزہ لے کر متعین کر سکے کہ وہ قانون قرآن و سنت کے مطابق ہے یا متصادم، اور تصادم اور عدم تطابق کی صورت میں اسے کس طرح کالعدم کیا جائے۔

یہاں مسئلہ یہ پیش آیا کہ عدالتوں کے جج حضرات بالعموم اس علم و تقویٰ سے آراستہ نہیں جو اس کام کو انجام دینے کے لیے درکار ہے۔ صحیح راستہ تو یہ تھا کہ قانون کی تعلیم کے نظام کو، وکلا اور ججوں کی تربیت، انتخاب، ترقی کے اصول و ضوابط کو تبدیل کیا جائے۔ ایک ایسا انتظام کیا جائے کہ ایک معقول مدت میں نیچے سے اوپر تک جج قانون کے علم کے ساتھ شریعت کا علم بھی رکھتے ہوں اور اخلاق و تقویٰ کے اعتبار سے بھی دینی معاملات میں قوم کے اعتماد کے مستحق ہو سکیں۔ یہ عمل صحیح اور معیاری ہونے کے باوجود وقت طلب تھا۔ اس لیے صدر ضیاء کے دور میں پہلے تمام ہائی کورٹوں میں شریعت بنچ کے قیام کی تجویز آئی جسے عدلیہ نے پسند نہیں کیا۔ پھر فیڈرل شریعت کورٹ کا راستہ اختیار کیا گیا جس پر ۱۹۸۰ سے عمل ہو رہا ہے اور جس کے لیے دستور میں ایک پورے باب کا اضافہ کیا گیا۔ اس میں چند بڑی بڑی خامیاں رہ گئیں:

۱۔ اس کا دائرہ کار محدود تھا۔ قوانین کی اکثریت اس کے دائرہ کار سے باہر تھی۔

۲۔ یہ صرف قانون یا اس کے کسی حصہ پر کلام کر سکتی تھی۔ انتظامی احکام (executive action) اس کے دائرے سے باہر تھے۔

۳۔ اس کے ججوں کا تقرر، تبدیلی، تنزلی وغیرہ کے بارے میں ایسے من مانے ضابطے بنائے گئے جو نہ صرف عدلیہ کی آزادی اور اس عدالت کے مستقل وجود کے منافی تھے بلکہ خود اسلام کے تصور عدل کے ساتھ بھی مذاق تھے۔

۴۔ اسے داد رسی اور عارضی احکام (interim injunction) کا اختیار حاصل نہ تھا۔ یعنی یہ عدالت بالکل بے طاقت تھی۔

۵۔ اس کو صرف حدود کے معاملات میں اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔ باقی اس کا اصل دائرہ اختیار صرف قوانین کے بارے میں رائے دینے تک محدود تھا۔ غنیمت ہے کہ اتنی گنجایش تھی کہ اگر اس کے دیے ہوئے وقت میں مقننہ قانون سازی نہ کرے یا سپریم کورٹ میں اپیل نہ ہو جائے تو کم از کم زیر نظر قانون کا خلاف شریعت حصہ معدوم ہو جائے گا۔ گو اس کی نوبت کم ہی آ سکی۔

اس طرح نفاذ شریعت (قانون کے جدید تصور کی حد تک) کے جو دو راستے ہو سکتے ہیں، عملاً دونوں ہی غیر موثر رہے ہیں۔ اور اس وقت سب سے اہم فیصلہ یہی کرنا ہے کہ ان میں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے، یا دونوں طریقوں کو بہ یک وقت جاری رکھا جائے (راقم کی بھی یہی رائے ہے) لیکن اس عمل کو موثر بنانے کے لیے جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے، دستور میں وہ ترامیم کی جائیں۔ نیز عملاً اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے جن دوسرے امور کی ضرورت ہے ان کی فکر کی جائے۔

نفاذ شریعت کا عمل محض قانونی عمل نہیں ہے، گو قانونی دائرے میں قانونی مشینری کے ذریعے اس کام کو انجام دینا ازبس ضروری بھی ہے اور اس کے لیے مزید موثر اقدامات بھی درکار ہیں۔ اس قانونی عمل کے ساتھ جن دوسرے اقدامات کی ضرورت ہے ہم پہلے ان کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر موجودہ پندرھویں دستوری ترمیم پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

(۱) پہلی اہم ترین چیز قانون کے ساتھ ساتھ پالیسی، پالیسی سازی کے طریق کار، پالیسیوں پر احتساب اور انتظامی احکامات کو بھی عدالتی مواخذے (judicial review) کے لیے کھولنا ہے۔ شریعت کے نفاذ کے لیے صرف قانون سازی ہی کافی نہیں، بہت بڑا دائرہ پالیسی سازی کا ہے اور اس طرف کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ اس کے لیے کوئی مشینری بھی موجود نہیں ہے۔ ہر وزارت آزاد ہے اور شرعی رہنمائی اور احتساب کا کوئی نظام نہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل محض ایک غیر موثر مشاورتی ادارہ ہے اور اس سے بڑھ کر اس کا کوئی تعلق حکومتی مشینری سے نہیں۔ یہ ایک دور دراز جزیرے کے طور پر کام کرتا ہے جبکہ ملک کے پلاننگ کمیشن اور تمام مشاورتی اداروں سے اس کا دستوری، انتظامی اور عملی تعلق (interaction) ہونا چاہیے۔ راقم کو اس کا عملی تجربہ اس وقت ہوا جب پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور وزیر منصوبہ بندی کی حیثیت سے نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی اور منصوبہ سازی کی کوشش کی گئی۔ معلوم ہوا کہ مشاورتی کونسل کا کوئی ربط کسی پالیسی ساز ادارے سے نہیں اور نہ پالیسی ساز اداروں نے یہ زحمت کی کہ اس ادارے سے کوئی استفادہ کریں۔ ہم نے پلاننگ کمیشن اور نظریاتی کونسل کے مشترک اجتماعات کیے اور ان کی مشترک کمیٹیاں تشکیل دیں تو معلوم ہوا کہ پالیسی سازی میں اسلام سے رہنمائی لینے کا عمل کس طرح متحرک کیا جا سکتا ہے۔

یہ بڑا قیمتی لیکن مختصر تجربہ تھا، پاکستان قومی اتحاد کے حکومت سے نکلنے کے بعد (۱۹۷۹) سارا انتظام بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب تک تمام پالیسی ساز اداروں اور افراد کو عملاً اس کام میں شریک نہ کیا جائے کوئی پیش رفت مشکل ہے۔ دوسرے، یہ کام محض وقتی طور پر نہیں، مستقل بلکہ اداراتی انتظام کی شکل میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے سب سے اہم چیز سیاسی اثر و رسوخ، عزم و ارادہ اور جذبہ عمل (political will) ہے۔ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نفاذ اسلام کے عمل کو غیر موثر اور غیر نتیجہ خیز کرنے والی چیز اسی سیاسی ارادے کی کمی ہے اور یہ صرف ایک فرد کے عزم کا مسئلہ نہیں، یہ پوری سیاسی مشینری اور اجتماعی قیادت کے ارادے اور عزم کا مسئلہ ہے اور جب تک یہ حل نہ ہو گا، گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔

(۲) دوسری اہم ترین ضرورت سیاسی عزم و ارادہ ہے جس کا اظہار ہر سطح پر ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انقلاب قیادت واقع ہو۔ اب تک کی تمام ہی قیادتوں کا حال (چند انفرادی استثنائی حوالوں کو چھوڑ کر) بڑا ہی مایوس کن رہا ہے۔ قانون سازی اور پالیسی کی تبدیلی کا آخری انحصار افراد کار کی تبدیلی اور انقلاب قیادت پر ہو گا۔ سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے کی قیادت میں اندر سے تبدیلی آئے یا اسے ایسے افراد سے تبدیل کیا جائے جو اس میدان میں صحیح قیادت اور نمونہ فراہم کر سکیں۔ اس قیادت کے لیے تین چیزیں ازبس ضروری ہیں: اول، اس کا اپنا عزم، وژن، کردار اور نمونہ۔ دوم، اس کا علم، تجربہ، صلاحیت کار، مشاورتی نظام اور اعلیٰ کارکردگی۔ سوم، ایک موثر نظام شوریٰ اور احتساب تاکہ قیادت صحیح راستے پر قائم رہ سکے اور اسے اس راستہ پر گامزن رکھا جا سکے۔

اس سلسلے میں اہم ترین مثال سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کی ہے کہ کس طرح ایک ایسے نظام میں جس میں بگاڑ واقع ہو گیا تھا اور قدیم جاہلیت نے اسلام کی انقلابی اصلاحات کو غیر موثر یا معدوم کر کے پیچھے کی طرف چلانا شروع کر دیا تھا، انھوں نے ڈھائی سال کے مختصر وقت میں دوبارہ نظام حکومت و ریاست کو خلافت راشدہ کی راہ پر ڈالا۔ اور بے نفسی، قربانی، مفاد پرست طبقات پر ضرب اور ریاست کو اس کے اسلامی مقاصد کے لیے دوبارہ منظم کرنے کا کام انجام دیا۔ اپنی ذات سے اصلاح کا آغاز کر کے، اپنے خاندان اور قبیلہ کو لگام دی۔ حق پرستی، اصولوں پر عدم لچک، مظلوموں کی داد رسی، میرٹ کا اہتمام اور نتائج سے بے پروا ہو کر باطل سے سمجھوتوں کی روش سے اجتناب کیا۔ یہ تھا قیادت کا وہ نمونہ جو عمر ثانی نے پیش کیا اور یہی وہ نمونہ ہے جس کی آج ضرورت ہے۔

(۳) دستور، قانون، پالیسی اور قیادت کے بعد تعلیم و تربیت، مطلوبہ مردان کار کی تیاری اور ترغیب و ترہیب کے ایسے نظام کا قیام ضروری ہے جس کے نتیجے میں صحیح افراد ہر سطح پر ذمہ داری کے مقام پر آ

سکیں۔ لوگوں کو اعتماد حاصل ہو اور وہ نظام پر بھروسہ کرنے لگیں۔ جہاں ضروری ہے کہ پہلے قدم پر ہی اس کام کا آغاز کر دیا جائے وہاں یہ بھی ضروری ہو گا۔ اسے مستقل مزاجی سے جاری رکھنے کا اہتمام ہو تاکہ فطری انداز میں مناسب نظام الاوقات کے تحت تبدیلی واقع ہو سکے۔

(۴) اس پورے عمل میں جہاں قانون کی بڑی اہمیت ہے، وہاں افراد اور معاشرے کی ایسی تیاری ضروری ہے کہ لوگ دلی آمادگی اور خوش دلی سے شریعت کے نفاذ کے عمل میں شریک ہوں۔ یہ کام نہ محض وعظ سے ہو سکتا ہے اور نہ صرف جبر اور ڈنڈے کی قوت سے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ نفاذ شریعت کا ہمیں سکھایا ہے اور جس کا نمونہ آپؐ نے پیش فرمایا، اس کا نمایاں خاصہ، دل اور ذہن کی تبدیلی اور اخلاق و کردار کے انقلاب کے ساتھ، قانون اور حکومت کی انتظامی اور تادیبی قوتوں کا متوازن اور حسین امتزاج ہے۔ نفاذ شریعت کے لیے ہر دور میں ان دونوں دھاروں کا آپس میں ملنا اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچانا ضروری ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر عمل ہے اور اس میں سب کی شرکت ضروری ہے۔ یہ مقصد پابندیاں لگانے اور ڈر اور خوف کی فضا پیدا کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے آزادی، اختلاف اور رواداری کا ہونا ضروری ہے، ورنہ آمریت اور استبداد کی فضا میں یہ عمل جاری نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے تو حقوق کا احترام، فرائض کی ادائیگی کا جذبہ، شوریٰ کی فضا، نیکیوں میں مسابقت کا شوق، ایک دوسرے کے لیے احترام، ایثار، قربانی اور باہم معاونت درکار ہے تاکہ گرتوں کو تھاما جا سکے اور بے راہ روی کا شکار ہو جانے والوں کو سینے سے لگا کر جہنم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچایا جا سکے۔ معاشرے میں یہ فضا اور یہ جذبہ پیدا کرنا بھی نفاذ شریعت کا لازمی حصہ ہے۔

(۵) یہ پورا کام جس ذہن اور جذبے سے ہونا چاہیے وہ وہی ہے جس کا نمونہ حضور اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا، یعنی دنیا میں انسانوں کے درمیان انصاف اور حقوق العباد کی ادائیگی، اور اصل منزل آخرت کی کامیابی اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کا حصول۔ شریعت کے احکام و ضوابط کو مقاصد شریعت کو نظرانداز کر کے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ مقاصد بہت واضح ہیں یعنی ● دین و ایمان کا تحفظ ● جسم و جان کی حفاظت ● اخلاق، عصمت، خاندان اور نسل انسانی کا تحفظ ● عقل و شعور کی حفاظت اور ● مال کا تحفظ۔ انھی کے قیام سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے۔ یہ بڑی معنی خیز حقیقت ہے کہ اسلام کے تعزیری قانون میں جن حدوں کے تحفظ کو قرآن و سنت نے سزاؤں کے تعین کے ساتھ طے کر دیا وہ یہی پانچ مقاصد ہیں۔ دنیا کے دوسرے تعزیری قوانین میں سیکڑوں نہیں ہزاروں جرائم اور ان کی سزائیں ہیں، لیکن اسلام نے جن جرائم اور ان کی سزاؤں کو حدود کا مقام دیا وہ یہی پانچ چیزیں ہیں۔ دین و ایمان کی حفاظت کے لیے ارتداد کی سزا کی حد، جسم و جان کے تحفظ کے لیے قصاص ودیت کا قانون، اخلاق، خاندان، عزت و

عصمت اور نسل کے تحفظ کے لیے زنا اور قذف کی حدود، عقل کے تحفظ کے لیے تحریم خمر اور شراب کی حد اور مال کے تحفظ کے لیے سرقہ اور حرابہ کی حدود--- یہ حدود محض سزائیں نہیں، یہ تو شریعت کے اصل مقاصد اور انسانی معاشرے کی اصل بنیادوں کے تحفظ کا نظام ہیں۔ مقصد سزا دینا نہیں، مقصد ان بنیادوں کا تحفظ، ان کی مضبوطی اور انسانی زندگی کو عدل و انصاف اور عزت و خوش حالی کی برکتوں سے مالا مال کرنا ہے۔

نفاذ شریعت کے یہ تمام پہلو وہ ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور مل کر ایک نامیاتی کل (organic whole) بناتے ہیں۔ نفاذ شریعت کے پروگرام کو ان سب کا احاطہ کرنا چاہیے ورنہ وہ نامکمل اور غیر موثر رہے گا۔

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں اگر حکومت کے تجویز کردہ پندرھویں ترمیمی بل کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس میں کچھ بہت ہی بنیادی خامیاں، کمزوریاں اور جھول نظر آتے ہیں۔ البتہ ان پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم اس امر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن و سنت کو دستور کی دفعہ ۲ میں ملک کا بالاترین قانون بنانے کا اعلان صحیح سمت میں ایک قدم ہے اور ہم اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔

بلاشبہ دستور میں قرارداد مقاصد کا پہلے دستور کا دیباچہ ہونے کی حیثیت سے اور ۱۹۸۵ میں ترمیم کے ذریعے دفعہ ۲-الف کی شکل میں ایک موثر (substantive) حصہ بن جانے اور دفعہ ۲۲۷ میں قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی پر پابندی کے باوجود یہ سقم تھا کہ شریعت کی حقیقی اور مکمل بالادستی تسلیم نہیں کی گئی تھی۔ یہ بات خاص طور پر دستوری امور پر پچھلے چالیس برس میں کیے جانے والے اہم عدالتی فیصلوں کی روشنی میں اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ جب ۱۹۵۶ اور ۱۹۶۲ کے دساتیر کو مارشل لا کی ضرب سے توڑ دیا گیا تو لاہور ہائی کورٹ نے اور پھر فیڈرل کورٹ نے دو فیصلوں میں یہ جرات مندانہ اعلان کیا کہ قرارداد مقاصد ناقابل تنسیخ ہے۔ یہ پہلی دستور ساز اسمبلی کا طے کردہ بنیادی وثیقہ (دستور اساسی) ہے جسے grandnorm کی حیثیت حاصل ہے۔ عاصمہ جہانگیر کیس میں یہ چیز خاص طور پر سامنے آئی لیکن جلد ہی سپریم کورٹ میں جسٹس حمود الرحمٰن بنچ نے ایک اہم فیصلے میں یہ پوزیشن اختیار کی گو قرارداد مقاصد سب سے اہم دستوری دستاویز اور اعلانیہ ہے مگر چونکہ یہ دستور کا موثر حصہ نہیں اس لیے اسے بالادستی حاصل نہیں۔ اس سقم کو دور کرنے کے لیے جنرل ضیاء الحق نے اسلامی نظریاتی کونسل کے مشورے پر دستور کی دفعہ ۲- الف کی شکل میں قرارداد مقاصد کو دستور کا قابل تنفیذ حصہ بنا دیا۔ اس کے بعد چند بڑے اہم فیصلے کراچی اور لاہور کی عدالت ہائے عالیہ میں ہوئے جن میں قرارداد مقاصد کو باقی دستور پر حاوی قرار دیا گیا اور اس کی روشنی میں عائلی قانون کے تحفظ (protection) اور چند دوسرے امور کا جائزہ قرارداد مقاصد کی روشنی میں لیا گیا۔

لیکن پھر سپریم کورٹ نے جسٹس نسیم حسن شاہ کے بنچ میں ۱۹۹۳ کے دوران حاکم خاں کیس میں اس رجحان کے آگے بریک لگا دیا اور یہ طے کیا کہ ۲- الف بھی دستور کی ایک دفعہ ہے جس کی میزان پر باقی دفعات کو پرکھا نہیں جا سکتا۔ یہ وہ فیصلہ ہے جس کے بعد دستوری طور پر ضروری ہو گیا کہ قرآن و سنت کی بالادستی کی حیثیت کو صاف لفظوں میں شامل دستور کیا جائے اور اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ قرآن و سنت، دستور کے دوسرے اندراجات، قانون، عدالتی فیصلوں، غرض ہر چیز پر فائق اور بالاتر ہوں گے۔ ملکی قانون کی اصل شریعت ہے اور باقی ہر چیز اس کے تابع۔ اس ترمیم کے بغیر سپریم کورٹ کا مندرجہ بالا فیصلہ موثر رہتا ہے اور قرآن و سنت اور قرارداد مقاصد اصل بالاتر قانون قرار نہیں پاتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ ترمیم ہو۔ محض اسلام کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان اور دفعہ ۲۲۷ اس کمی کو دور کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس حد تک ترمیم ازبس ضروری ہے اور اس کو جلد از جلد دستور کا حصہ بنانا چاہیے۔

اس مثبت پہلو کی تائید کے ساتھ ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ترمیم اپنی موجودہ شکل میں ناقص اور منظوری سے پہلے اصلاح طلب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے حکومت نے بغیر مشورہ اور بغیر مناسب تیاری، بس جوش میں یا کچھ وقتی مصالح اور عاجلانہ فوائد کی امید پر یہ مسودہ اسمبلی میں پیش کر دیا اور وزیراعظم صاحب نے تقریر فرما دی کہ نفاذ شریعت کا وعدہ بھی پورا ہو گیا۔ یہ تمام باتیں بہت سطحی ہیں۔ اس ترمیم کی ضرورت مسلم ہے لیکن اس کو انسانی حد تک غلطیوں اور تسامحات سے پاک ہونا چاہیے۔ دستور کی ترمیم کا معاملہ ویسے بھی بہت نازک اور ذمہ داری کی چیز ہے لیکن جب معاملہ شریعت کے نفاذ کا ہو تو یہ اور بھی زیادہ نازک کام ہو جاتا ہے۔ اس سہل انگاری سے اسے انجام دینا نہ صرف بڑی غیر ذمہ داری کی بات ہے بلکہ ملک و ملت کے لیے بڑا خطرناک اور پریشان کن ہو سکتا ہے۔

ہم تمام اعتراضات کو الگ بیان کرنے کے بجائے یہاں پر صرف اپنی تجاویز پر اکتفا کر رہے ہیں جن پر غور کرنے سے ہمارے اعتراضات بھی آپ سے آپ سامنے آ جائیں گے:

۱- اس نوعیت کی ترامیم کو جلد بازی سے ایوان میں نہیں لانا چاہیے۔ بل پیش کرنے سے پہلے اسے وسیع مشاورت کے نظام سے گزرنا چاہیے۔ یہ موضوع تو ایسا تھا کہ اس سے نفاذ شریعت کے پورے مسئلے پر سیر حاصل بحث ہوتی اور پھر دستوری ترمیم، قانون کی تبدیلی کا طریقہ اور اس کے لیے اقدامات، پالیسیوں کی تشکیل نو کا نظام، احتساب کی شکل، تعلیم اور معاشرے کی تیاری کا پروگرام اور اس کے لیے دوسرے قوانین کے مسودے، یہ تمام چیزیں ایک قرطاس ابیض (white paper) کی شکل میں قوم کے سامنے پیش کی جاتیں۔ اسی میں دستوری ترمیم کا مجوزہ مسودہ بھی ہوتا تاکہ اس پر کھل کر بحث ہو سکے اور تجاویز دی جا سکیں۔ پھر اس بحث اور تجاویز کی روشنی میں حکومت دستوری بل کا مسودہ تیار کر کے ایوان میں پیش کرتی۔ اب بھی یہ

راستہ اختیار کیا جائے تو اس میں خیر ہے۔

۲۔ دستوری ترمیم کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اپنی موجودہ شکل میں اس میں پانچ امور کا احاطہ کیا گیا ہے اور ایک ہی تیر سے ان سب کا معاملہ طے کر دیا گیا ہے۔ یعنی: ۱۔ قرآن و سنت کی بالادستی، ۲۔ مرکزی حکومت کا اختیار۔ دستور، قانون اور عدالتی فیصلوں سے بے نیاز ہو کر، ۳۔ شخصی قانون کے معاملے میں ہر فقہ کی رائے کا احترام، ۴۔ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ اور ۵۔ دستور میں ترمیم کے طریقے کو شریعت کے نفاذ میں مانع مشکلات کو دور کرنے کے لیے قانون کی سطح پر لے آنا--- ان سب کا اس طرح جمع کر دینا قرین حق و انصاف نہیں۔ ہر مسئلہ کو الگ الگ لیا جائے، جو ضروری ہو، اس کو معقول شکل میں شامل کیا جائے اور جو غیر ضروری ہو یا جس میں فتنہ کا احتمال ہو اس کو ترک کر دیا جائے۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ اس ترمیم کی شق ۱ میں قرآن و سنت کو بالاترین قانون بنایا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ لکھ دیا جائے کہ "یہ شق دستور کے باقی تمام مندرجات، ہر قانون اور عدالتوں کے ہر فیصلے پر حاوی ہو گی"۔ اس طرح شریعت کی بالادستی دستور و قانون کی حد تک غیر مشتبہ اور حتمی ہو جائے گی۔ یہ سب سے بنیادی ترمیم ہے اور اسے بھی اس ترمیم کا مرکزی حصہ ہونا چاہیے۔

۳۔ ہماری نگاہ میں مرکزی حکومت کے لیے کسی خصوصی اختیار کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے اپنے دائرے میں داخل ہر معاملے میں حاصل ہے اور انھی آداب و ضوابط کے مطابق نفاذ شریعت کی ذمہ داری اسے ادا کرنی چاہیے۔ اسے دستور، قانون اور عدالت تینوں کے سامنے جواب دہ رہنا چاہیے، ورنہ خطرہ ہے کہ ملک شریعت کے نام پر آمریت کے راستے پر چل پڑے گا اور اس کے قرائن اور رجحانات بھی موجود ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ شق ۵ کے استثنائی اختیارات صرف شق ۱ میں قرآن و سنت کی بالادستی کے اصل معاملے کو حاصل ہوں، حکومت کے احکامات کو نہیں۔ اگر اس شق کو رکھنا حکومت ضروری سمجھتی ہے تو پھر اس میں مناسب ترمیم کے ذریعے مرکزی حکومت کے ساتھ صوبائی اور لوکل حکومتوں کا اضافہ ہو اور دستور کے وفاقی نظام کے طے کردہ اختیاراتی فریم ورک میں ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ نیز مرکزی یا صوبائی حکومت اس سلسلے میں کوئی متبادل یا معاون مشینری بنائے تو وہ باقاعدہ قانون کے ذریعے ہو تاکہ من مانی کارروائیوں کا دروازہ نہ کھلے۔ یہ پورا عمل شفاف بھی ہونا چاہیے اور اسے احتساب سے بالا بھی نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ مجوزہ ترمیم کا سب سے قابل اعتراض پہلو دستور میں ترمیم کے طریقے کو تبدیل کرنا ہے جو اپنے اندر بے پناہ خطرات رکھتا ہے۔ غضب ہے کہ دستور میں ترمیم کو جو دنیا کے سارے دساتیر میں سب سے مشکل ہوتا ہے، عام قانون سازی کی اس سطح پر لے آیا گیا ہے جہاں دونوں ایوانوں کی کل تعداد کی دو تہائی اکثریت (جو اس وقت درکار ہے) ہی ختم نہ ہو گی بلکہ دونوں ایوانوں کی تعداد کی عام اکثریت (یعنی ۵۰ فی صد)

بھی مطلوب نہیں۔ اس ترمیم کی رو سے ایوان میں جتنے افراد بھی موجود ہوں بس ان کی اکثریت کافی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کورم کی حد تک بھی اگر ارکان موجود ہیں تو صرف ان کی سادہ اکثریت سے دستور تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں علم ہے "مشکلات" دور کرنے کے الفاظ کو کہاں تک وسعت دی جا سکتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے سپریم کورٹ کی ایک ایسی ہی اجازت سے کام لے کر پہلا پروویژنل دستور نافذ کیا اور پھر دستور کی بحالی کے موقع پر ۱۰۴ ترامیم کر ڈالیں۔ یہ اختیار ہرگز ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ دستور پر نظرثانی کی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مناسب راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے جسے ہم بعد میں تجویز کر رہے ہیں۔

۵۔ جہاں تک شق ۳ اور ۴ کا تعلق ہے یہ غیر ضروری ہیں۔ دستور میں دونوں امور (شخصی قانون میں ہر مکتب فکر کی فقہ کا احترام اور اقلیتوں کی مذہبی، تعلیمی اور ثقافتی آزادی) واضح طور پر مرقوم ہیں اور ہر جگہ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک قسم کے احساس کمتری کی غمازی کرتا ہے جس کا دستور میں اس طرح اظہار مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اگر خاص پریشر گروپوں کو اس سے مطمئن کیا جا سکے تو ہمیں کوئی اصولی اعتراض نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اقلیتی گروہ اور خصوصیت سے عیسائی اقلیت جو آبادی کا ایک فی صد ہے، اپنے حقوق پر نہیں، مسلمانوں کے اس حق پر معترض ہے کہ وہ اپنے ملک میں شریعت کیوں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں یہ اسی سامراجی ذہنیت کا مظہر ہے جو برطانوی اور دوسرے مغربی استعماری غلبے کے دور میں عیسائی اقلیتوں نے ان سامراجی طاقتوں کے ایما پر اور ان کے مفاد میں اختیار کیا تھا اور آج بھی مغربی اقوام ہی ان کو اس پر اکسا رہی ہیں۔ فرانس میں مسلمان عورت کو اسکارف پہننے کی اجازت نہیں اور یہاں یہ اقلیتی گروہ مسلمانوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اپنے دین پر نہ چلو۔ اس ذہنیت کا علاج معذرتیں کرنا اور مراعات دینا نہیں بلکہ قرآنی اعلان، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ہے۔

۶۔ اس دستوری ترمیم کا سب سے بڑا سقم یہ ہے کہ اس میں اس اصل مسئلے کا کوئی حل نہیں نکالا گیا جس کی وجہ سے قرارداد مقاصد کے حصہ دستور بننے کے بعد بھی قرآن و سنت کی بالادستی کے واضح اعلان کی ضرورت تھی۔ دراصل سپریم کورٹ نے دستور کی تعبیر کے سلسلے میں ایک بڑا ہی بنیادی فیصلہ کر دیا ہے اور وہ یہ کہ دستور کی ہر دفعہ اپنی جگہ مستقل بالذات ہے اور دوسری دفعات پر حاوی نہیں الا یہ کہ اس کی وضاحت کر دی گئی ہو جیسے ۵۸-۲(ب) یا ۲۰۳-الف میں کی گئی ہے۔ نیز دستور کی کچھ دفعات خود تنفیذی (self executing) ہیں جیسے دفعہ ۸ اور کچھ خود تنفیذی نہیں جیسے ۲-الف۔ ترمیم کی اصل ضرورت ہی اس لیے ہے کہ ان کمزوریوں کو دور کر دیا جائے اور ہماری مجوزہ شکل میں یعنی شق ۱ میں not withstanding any provision in the constitution, law or decision of any court of law کے اضافے کے بعد یہ دفعہ پورے دستور اور قانونی نظام پر حاوی ہو جائے گی۔ اور یہی مقام قرآن و سنت کا ہونا

چاہیے۔ البتہ اس میں جو مشکل ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر اپنے اپنے انداز میں مولانا محمد تقی عثمانی جج سپریم کورٹ شریعت بنچ اور ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن سابق چیف جسٹس فیڈرل شریعت کورٹ نے کیا ہے۔ یعنی یہ کون طے کرے گا کہ تصادم کہاں ہے اور وہ کس طرح دور ہو۔ اس کے لیے کئی راستے اختیار کیے جاسکتے ہیں لیکن اس مسئلے سے تعارض کیے بغیر گزر جانے کے معنی یہ ہیں کہ عدالتی مجادلوں کا ایک باب کھل جائے اور قوم مزید الجھاؤ کا شکار ہو، شریعت عدل تو فراہم نہ کرسکے مگر قانونی انارکی پیدا ہونے کا خطرہ وجود میں آجائے۔ یہ شریعت کے ساتھ کوئی اچھا معاملہ نہیں ہوگا۔

(الف) اس امر کی ضرورت ہے کہ دستور میں پائے جانے والے سقم اور تضادات اور قوانین میں پائے جانے والے تصادم اور تناقضات کو الگ الگ لیا جائے۔ دستور کو مستقلاً مرکزی حکومت یا خود عدالتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ یہ سب دستور ہی کی پیداوار ہیں اور اپنے اختیارات دستور ہی سے اخذ کرتے ہیں۔ اس لیے دستور میں ترمیم کے لیے ایک دستوری کمیشن بنایا جائے جو ماہرین دستور، بالغ نظر اور معتمد علیہ سیاست دانوں اور علما پر مشتمل ہو۔ اسلامی نظریاتی کونسل سے بھی رجوع کیا جائے اور یہ کمیشن ۶ ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کے اندر ان تمام تناقضات کی نشاندہی کردے جو شریعت کی بالادستی کے نقطہ نظر سے دستور کی مختلف دفعات میں ہیں اور پارلیمنٹ دستور میں مناسب ترمیم کے ذریعے ان تناقضات کو دور کر دے۔ یہ کام ایک بار ہو جانا چاہیے اور یہ دروازہ ہرگز کھلا نہیں رہنا چاہیے کہ حکومت یا کوئی گروہ ہر روز ایک نیا مسئلہ اٹھاوے۔

(ب) عام قوانین کے لیے دو راستے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ یا دستور کی دفعہ ۸ کی طرح دفعہ ۲ میں بھی یہ بات شامل کردی جائے کہ جس طرح بنیادی حقوق سے متصادم قوانین دستور کے تحت ختم ہو جائیں گے، اسی طرح قرآن و سنت کے منافی موجود الوقت قوانین ایک خاص مدت کے اندر ختم (void) تصور کیے جائیں گے، مثلاً ایک سال۔ بہت سا کام اسلامی نظریاتی کونسل اور لا کمیشن کرچکے ہیں۔ پارلیمنٹ ان سب پر غور کرے اور ایک سال میں مروجہ قوانین کی اصلاح کرے ورنہ وہ آپ سے آپ ختم ہو جائیں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ ججوں کی تعداد میں میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے دائرہ کار کو وسیع کیا جائے اور دستور کے علاوہ تمام قوانین کے احتساب اور جائزے کا اختیار اس کو دے دیا جائے تاکہ معمول کے عمل سے فیڈرل شریعت کورٹ کے ذریعہ تمام قوانین شریعت سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ ملک کی جس عدالت میں بھی کسی قانون کے خلاف شریعت ہونے کا سوال اٹھے، اسے فیڈرل شریعت کورٹ کو سماعت کے لیے بھیج دیا جائے۔ اگر یہ اختیار ہر عدالت کو دیتے ہیں تو اس میں کنفیوژن پیدا ہونے کا زیادہ خطرہ ہے اور علم و اہلیت کے اعتبار سے بھی ہر عدالت پر اس باب میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ عام عدالتوں میں، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ سمیت، غیر مسلم ججوں کو بھی وہی حیثیت حاصل ہے جو مسلمان ججوں کو اور

شریعت کے ہم آہنگ یا متصادم ہونے کا فیصلہ غیر مسلم ججوں کو نہیں سونپا جا سکتا۔ اس لیے اس کا معقول ترین راستہ فیڈرل شریعت کورٹ کے اختیارات' وسائل اور تعداد میں اضافہ اور لائق' متدین ججوں اور مناسب تعداد میں علما کی شمولیت ہے۔ اس طرح اس مسئلے کو بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ مطلوبہ دستوری ترمیم میں فیڈرل شریعت کورٹ کے اختیارات کا مسئلہ لازماً طے ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ بات ضروری ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ میں ججوں کی تقرری مستقل ہونی چاہیے اور تقرری' تبادلہ' معزولی' کوئی اور کام سونپنا وغیرہ کے سلسلے میں وہی ضابطہ ہونا چاہیے جو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں ہے۔ نیز اس عدالت کو داد رسی اور عارضی احکام کے اختیارات بھی ہونے چاہییں۔ اسی طرح احتساب کے نظام کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ قوانین کے ساتھ ساتھ انتظامی فرمان (order executive) کے لیے بھی کچھ تحدیدات کے ساتھ عدالتی نظرثانی کا دروازہ کھلنا چاہیے اور یہ حق فیڈرل شریعت کورٹ کو حاصل ہونا چاہیے۔

۸۔ قانون کی تعلیم کے نظام کی فوری تبدیلی اور موجودہ عدلیہ کے تمام افراد کے لیے ہر سطح پر تعلیمی اور تربیتی پروگرام بننے چاہییں۔ ۱۹۸۰ کی اصلاحات میں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی' جوڈیشل اکیڈمی اور انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس اور دعوہ اکیڈمی کا قیام اسی مقصد کی طرف پیش رفت کے لیے تھا۔ اگر ہم فی الحقیقت شریعت کے نفاذ کے باب میں سنجیدہ ہیں تو ان سب پہلوؤں پر فوری توجہ کی ضرورت ہو گی۔ پوری حکومتی اور انتظامی مشینری کو اس کام کے لیے تیار کرنا ہو گا۔ عوام کی تربیت و تعلیم بھی ضروری ہے۔ ان سب پہلوؤں کا احاطہ کیے بغیر محض وقتاً فوقتاً نفاذ شریعت کے اعلان کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا بلکہ ہماری نگاہ میں یہ چیزیں شریعت کی تقدیس کے منافی ہیں' عوام کو مایوس کرنے والی ہیں اور ہمیں ڈر ہے کہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں۔ سیدھا اور سادہ راستہ تو یہی ہے کہ ہم پوری دیانت' اعتماد اور شفاف انداز میں ان تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں جو نفاذ شریعت کے لیے ضروری ہیں' ورنہ کم از کم ایسے اقدامات سے پرہیز کریں جو متفق علیہ معاملات کو بھی متنازع بنانے والے' نت نئی بحثوں کو جنم دینے والے' مخالفین کو نئے حملے کی دعوت دینے والے اور مخلص اور سادہ عوام کو دھوکہ دینے والے ہوں۔ ہمیں اس ارشاد ربانی کو سامنے رکھنا چاہیے کہ:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ○ (ابراہیم ۱۴:۷)

اور یاد رکھو' تمھارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔ اور اگر کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔

(ری پرنٹ دستیاب ہیں۔ منشورات' منصورہ' ملتان روڈ' لاہور سے' ۴۰۰ روپے سیکڑہ)